۵

خطہ پاک اوچ میں اسلامی فن تعمیر کے نادر نمونے

محمد خورشید

فن تعمیر دیگر انسانی کاوشوں کی طرح مشاہدے اور معاشرتی اثرات کی پیداوار ہے۔ انسان حصول علم کے لئے دوسروں کی اختراعات اور ایجادات کو دیکھتا ہے اور یہ عمل جدید فن کی نشو و نما کا ذریعہ بنتا ہے۔ کسی بھی فن تعمیر پر متعلقہ علاقے کی آب و ہوا اور طرز معاشرت کے علاوہ سیاسی، معاشی اور مذہبی حالات بہت حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ یوں انسانی ضروریات کے ان خارجی عوامل کے پیش نظر فن تعمیر عالم وجود میں آتا ہے اور اس طرح ضروریات کی مسلسل نئی تعبیر اور حالات میں اتنی ہی مسلسل ترمیم سے فن تعمیر لامتناہی تغیرات اور انقلاب سے گذرتا رہتا ہے۔ اسلامی فن تعمیر کی ابتداء اس عظیم مذہبی اور سیاسی انقلاب میں مضمر ہے جو ساتویں صدی عیسوی میں وقوع پذیر ہوا اور جس کے نتیجے کے طور پر اسلامی فن تعمیر کا آغاز مسجد نبوی کی تعمیر سے ہوا۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلامی فتوحات کے بعد یکے بعد دیگرے ابتدائی عرب فن تعمیر، سلجوقی، ایرانی اور مملوکی فن تعمیر کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ جبکہ اسلامی فن تعمیر کی یادگار عمارتیں سلجوقی اور مملوکی دور میں ملتی ہیں کیونکہ اس دور میں اینٹ اور گچ کے ساتھ ساتھ قیمتی پتھر کے استعمال نے جگہ لے لی تھی۔ یہاں یہ بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ اگرچہ مسلمانوں کا تعلق مختلف خطوں، نسلوں، رسم و رواج اور معاشرتی طور طریقوں سے تھا مگر مذہب اسلام کے مشترکہ رشتے سے منسلک ہونے کے سبب مسلمانوں کے طرز تعمیر میں بڑی مماثلت موجود تھی۔ جیسا کہ محراب، مینار اور گنبد ہر خطے میں اسلامی فن تعمیر کی نمایاں پہچان رہی ہے۔

اسلامی فتوحات کے نتیجے کے طور پر جہاں برصغیر پاک و ہند سے اسپین تک مفتوحہ اقوام کی تعمیر کردہ عمارات مسلمانوں کے تسلط میں آئیں وہاں مختلف پیشوں سے وابستہ اہل علم اور ماہرین کی خدمات بھی حاصل ہوئیں۔ یہی وہ علم اور مہارت تھی جو بعد میں اسلامی تہذیب میں ضم ہو کر ایک نئے مزاج کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی اور اس سے ایک ایسا فن تعمیر ترتیب و تشکیل پایا جو کبھی سراسینی (Saracenie) کبھی اسلامی اور کبھی مسلم یا محمدی فن تعمیر کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ فن تعمیر اسپین سے

ہندوستان تک خواہ کسی بھی اسلامی ریاست میں پروان چڑھا ہو اور خواہ کوئی بھی قوم اسے اختیار کرتی رہی ہو، اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتا ہے۔ ایک ایسا مزاج جس کو توضیح و تشریح کی نسبت سے زیادہ آسانی، کے ساتھ ممیّز کیا جا سکتا ہے۔ یہ عمومی صفات نہ صرف مختلف اقوام کے ایک مشترکہ مذہب اور ایک مشترکہ سماجی نظام کو قبول کرنے کا نتیجہ ہیں بلکہ دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں میں فنی طریقہ کار کے تصورات بلکہ خود صناعوں کے ان تصورات کی اشاعت کے مواقع پیدا ہونے کے رہین منت ہیں۔ بلا شبہ نشر و اشاعت کا یہ طریق عمل فتوحات اور قبول اسلام کا ایک فوری نتیجہ تھا اور یہ بیشتر مفتوحہ اقوام کے ان صناعوں کی بدولت ہوا جن کے فلزی، چوبی، چرمی اور بافتی کاموں کی اسلامی افواج کو اپنے جنگی مقاصد کے لئے ضرورت تھی۔ ابتدائی فتوحات کے بعد حج بیت اللہ جس میں دنیائے اسلام کے ہر حصے سے لوگ جمع ہوتے تھے، ایسی رسم تھی جو عالم اسلام کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک فنی علم کی نشر و اشاعت کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ علاوہ ازیں شخصی حکومت کے طریقے نے (مستقلاً یا عارضی طور پر) صناعوں کی جماعتوں یا انفرادی کاریگروں کی نقل مکانی کو جہاں ان کی خدمات درکار ہوتیں ممکن بنا دیا تھا۔ اس کے علاوہ اسلامی ممالک کی مختلف حکومتوں میں خاندانوں کے عروج و زوال اور معاشی بدحالی نے ان صناعوں کو اپنی مرضی و اختیار سے ایسے حصوں میں منتقل ہونے پر مجبور کیا جہاں کسی نئے اولوالعزم حکمران کے عروج نے مزید نفع بخش روزگار کا میدان پیدا کر دیا تھا[۲]۔ اگرچہ ان حالات نے اسلامی فن تعمیر کو جلا بخشی تاہم اس سے نسلی اور جغرافیائی تقاضوں سے پیدا ہونے والی خصوصیات کا اظہار مفلوج ہونے سے محفوظ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ خواہ کسی فن تعمیر کا تعلق اسلامی ہندوستان سے ہو یا اسپین کی اسلامی حکومت سے، ان میں ایک واضح مماثلت پائی جاتی ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں سندھ کی فتح (۷۱۲ء) اور عرب حکومتوں کے قیام کے نتیجے کے طور پر برصغیر کے معاشرتی و سماجی یعنی رسم و رواج اور رہن سہن کے طریقوں میں نمایاں تبدیلی وقوع پذیر ہوئی۔ تعمیرات کے میدان میں جدت اور نئی طرح پیدا ہوئی اور طرز تعمیر کا نیا فن متعارف ہوا۔ نئے شہروں اور قصبات کی بنیاد رکھی گئی جبکہ پرانے شہروں کو جدید بنیادوں پر ترقی دی گئی۔ اسلامی روایت کے مطابق منصورہ، بھنبور، سہون، نیرون، ملتان اور دیگر بہت سے شہروں میں مساجد تعمیر کی گئیں جنہیں برصغیر پاک و ہند کے اسلامی فن تعمیر میں بنیادی مقام حاصل ہے۔ اس کے بعد گیارھویں صدی کے آخر

میں سلجوقی حملے کے نتیجے کے طور پر آرمینیا اور اناطولیہ کے ایک بڑے حصے کے قبول اسلام کے بعد مشرق قریب میں اسلامی فن تعمیر کو پتھر میں ظہور کا نہایت عمدہ موقع ملا۔ اس کے بعد مملوکوں کی فتوحات نے انہیں صناعوں کی ایسی ملی جلی جماعت کا حاکم بنا دیا جو سنگی تعمیر میں مہارت رکھتے تھے یہ تعمیر کاری ایسی تحریکوں سے متاثر تھی جو اصلاً" میسو پٹیمیائی اور ایرانی تھیں۔ شمال سے آنے والے فاتحین کے ہمراہ یہ فن تعمیر، ماہرین تعمیر اور معماروں کے ذریعے بلاخر وسط ایشیا سے ایران کے راستے برصغیر پاک و ہند میں منتقل ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلامی فن تعمیر کا بھرپور اور موثر اظہار ایران میں ہوا جہاں یہ فن آہستہ آہستہ ترقی کر کے ایک امتیازی طرز اختیار کر گیا۔ ایرانیوں نے نہ صرف نئی عمارات تعمیر کیں بلکہ نئی وفاداریاں، سابق مذاہب کی تعمیرات سے رقابت اور اپنی جدید عمارات پر روز افزوں فخر و ناز کے جذبات بیدار کئے[۳]۔ ایرانی فن تعمیر کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ بحیثیت مجموعی یہ نہایت اعلیٰ اسلوب کا حامل تھا۔ جہاں تک نقشے اور گنبد بنانے کا معاملہ تھا اس فن تعمیر میں جدت اور نئی اختراع سے کام لیا گیا۔ اس کے علاوہ ایرانی فن تعمیر کے تحت شان و شوکت اور آرائش و زیبائش پر خاص توجہ دی گئی۔

پورے عہد اسلامی میں اینٹوں کو بہترین عمارتی تعمیراتی مواد تصور کیا جاتا رہا ہے۔ ایرانی نقشہ نویسوں اور معماروں نے خشتی تعمیر کو ایسی تکمیل تک پہنچایا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ کٹی ہوئی اینٹ جسے خشتی ٹائیل بھی کہا جاتا ہے، مزاروں اور دیگر عمارات کی تعمیر کے لئے برصغیر پاک و ہند میں بھی کثرت سے استعمال کی گئی، جو دراصل وسط ایشیائی روائتی طرز تعمیر کی ترجمان تھی۔ اسے سب سے پہلے وسط ایشیائی ماہرین تعمیر اور پھر ہندوستان کے مقامی معماروں نے پرشکوہ عمارات کی تعمیر کے لئے استعمال کیا۔ ایران کے خشتی معماروں کو عہد اسلامی کے ابتدائی دنوں میں اس فن میں مہارت کے سبب بہت شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ تاریخی شواہد سے یہ بات ثابت ہے کہ "عراق سے آئے ہوئے ایرانی معماروں نے ۶۸۰ء سے قبل مکہ معظمہ میں حضرت امیر معاویہؓ کا مکان اینٹ اور گچ سے بنایا تھا"[۴]۔ عمارتی لکڑی کی کم یابی اور چکنی مٹی کی افراط کے علاوہ اینٹ کے دیرپا اور کم قیمت ہونے کے سبب ایرانی ماہرین تعمیر پتھر کے مقابلے میں خشت کے استعمال کو ترجیح دیتے تھے۔ اس کے علاوہ فنی اعتبار سے ایرانی معماروں کے نزدیک اینٹ کا استعمال مناسب تھا۔ ایرانیوں کو اس ضمن میں یہ احساس بھی رہا کہ

عالیشان عمارات یادگار انداز میں تیار کی جائیں۔ لہٰذا عمارات کی ساخت خصوصاً" لداؤ اور گنبد کی تعمیر میں جدت طرازی، تناسب اجزا اور ہم آہنگی کا ترقی پذیر احساس اور متعدد صورتوں (خشتی، چونے گچ، رنگین چینی خزف) کی آرائش میں اعلیٰ درجے کا سلیقہ، شاعرانہ تخیل، صناعانہ کمال، سبک دستی اور عقلیت دونوں اعتبار سے، لطافت اور نفاست میں روز افزوں اضافہ، رنگوں کا استعمال اور وہ بھی اس طرح کہ ان کی فراوانی کے باوصف ہم آہنگی قائم رہے اور پھر اس آزادی اور کامیابی سے کہ کسی اور ملک کے فن تعمیر میں اس کا جواب نہیں ملتا۔ ایرانی معماروں نے پائیداری پر خاص توجہ دی ہے۔ جیسا کہ انہوں نے عمارات کے گنبد انتہائی سوجھ بوجھ سے تیار کئے جو پائیداری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں غیر ملکی حملے، خانہ جنگیاں اور زلزلے تباہی اور بربادی پھیلاتے رہے ہوں بلاشبہ صدیاں گذرنے کے باوجود ان بلند گنبد والی عمارتوں کا قائم رہ جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ ایرانی معماروں کا نصب العین ہمیشہ رہنے والی اور پائیدار عمارتیں بنانا تھا[5]۔

جہاں تک برصغیر پاک و ہند کے اسلامی فن تعمیر کا تعلق ہے اگرچہ طرز تعمیر سے متعلق وسط ایشیائی فنی مہارت سے استفادہ کیا گیا تاہم یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی فنون نے ایک حد تک جنوب مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کی اسلامی تہذیب سے علیحدہ آزادانہ نشو و نما پائی اور مقامی ہندی فن سے ایسی بہت سی باتیں اپناتے رہے جو اسلامی ضروریات و تصورات کے لئے موزوں ہوں اور ان کے سانچے میں ڈھل سکیں۔ ہندوستان کے تعمیری مسالے سے کام لینے کی ضرورت پہلے پہل مساجد و مقابر کی تعمیر کی وجہ سے پیش آئی اور یہ عمارتی مسالا یہاں آسانی سے دستیاب بھی تھا۔ ابتدا میں راج مزدوروں کی کمی کے باعث ہندو معماروں سے کام لینا پڑتا تھا۔ لہٰذا برصغیر کے ابتدائی اسلامی دور کی عمارات قدرے ہندو دور کی عمارتوں سے مماثلت رکھتی تھیں کیونکہ نئی تعمیرات کا عام خاکہ اور نمایاں ترین اجزا اسلامی طرز کے ہوتے تھے لیکن معمولی یا عام نوعیت کی تعمیراتی اور آرائشی جزئیات (ستون، دیوار گیریاں، کڑیوں کے داسے، مجوف چھجے، جھروکے) ملکی معماروں کے ذوق پر چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ لیکن سجاوٹ اور خوبصورتی کے لئے فینسی موزیک یا روغنی ٹائیل کا استعمال اس کے علاوہ خوبصورت بیل بوٹوں اور پچی کاری کا کام وسط ایشیا کے روایتی طرز تعمیر کی ترجمانی کرتا ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے اس فن کو وسط ایشیائی ماہرین تعمیر اور پھر برصغیر کے مقامی معماروں نے عمارات اور مقابر و مساجد کی

آرائش و زیبائش کے لئے استعمال کیا[6]۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ جہاں ہندوستانی مسلمانوں کو اسلامی برادری کی رکنیت کا اعزاز حاصل تھا وہاں انہیں وسط ایشیا اور ایران کی جانب سے تواتر کے ساتھ فوجی یلغار اور عربوں و ایرانیوں کی ثقافتی نخوت کا سامنا بھی تھا۔

اسلامی فن تعمیر کے اس تعارف اور برصغیر پاک و ہند کی تہذیب پر اس کے اثرات کی ہلکی سی جھلک پیش کرنے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خطہ پاک اوچ کی اسلامی فن تعمیر کی ترجمان عمارات کے عمیق جائزے سے قبل اس شہر کا تعارف پیش کیا جائے۔ تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اوچ برصغیر پاک و ہند کے قدیم تاریخ ساز مقامات میں سرفہرست رہا ہے۔ اس خطے میں جہاں ایک جانب سلطنتوں کے عروج و زوال کی داستانیں رقم ہوئیں اور علم و عرفان کے سوتے پھوٹتے رہے جو تشنگان علم کو سیراب کرتے رہے' اسلامی تصوف و شریعت کی شمعیں روشن ہوتی رہیں جنہوں نے کفر و ضلالت کے تاریک گوشوں کو منور کیا اور دنیا ان سے اکتساب نور حاصل کرتی رہی' وہاں علمی و روحانی شخصیات کی بدولت تہذیب و ثقافت کے ان گنت نقوش ابھرتے' مٹتے اور علوم و فنون کے اعلیٰ نمونے ترتیب پاتے رہے۔ تاریخی اعتبار سے اوچ وہ خطہ ہے جو ایک دور میں رانی دھسلا کا پایہ تخت تھا جہاں راجا کفند اور اس کے بیٹے آنند نے کوس لمن الملکی بجایا تھا اور جس کی سرسبزی و شادابی سے متمتع ہونے کی سکندراعظم کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ جو ہندو راجا اشوک اور کنشک کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا۔ جسے رائے خاندان کے زیر اقتدار قلعوں میں اہم فوجی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ جسے چچ حکمران نے بڑی حکمت عملی سے مسخر کیا۔ جہاں محمد بن قاسم کے قدم پہنچے اور محمود غزنوی نے جس کی تسخیر اپنے لئے ایک کارنامہ سمجھی۔ شہاب الدین غوری نے جس کی فوجی اور سیاسی اہمیت کے اعتراف کے پیش نظر اپنے معتمد سالار کو وہاں کا نائب مقرر کیا۔ جسے ناصرالدین قباچہ کی ریاست کا پایہ تخت بننے کا اعزاز حاصل ہوا جس خطے کو برصغیر پاک و ہند کے کم و بیش ہر قابل ذکر فرمانروا نے اپنی جولانگاہ بنایا جو علم و معرفت اور تصوف و روحانیت کا ایک عظیم مرکز رہا جس کی تاریخی قدامت نینوا اور بابل کی تہذیب سے قدیم ہے۔ وہاں آج عہد رفتہ کے ویران کھنڈروں' تباہ حال مقبروں اور بوسیدہ عمارتوں کے سوا کچھ باقی نہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں گنتی کے چند ایسے شہر ہیں جنہیں اسلامی تاریخ میں یہ اعزاز و مقام حاصل ہے کہ وہ شہر کی بجائے ایک تحریک کا علامتی مرکزی قرار پائے۔ دہلی اور لاہور

اگرچہ ہماری عظمت رفتہ کے امین ہیں اور ہماری ملی تاریخ کی مایہ ناز ہستیاں وہاں مدفون ہیں لیکن اولیت و قدامت کا شرف خطہ پاک اوچ کو حاصل ہے جہاں ایسی بے شمار ہستیاں دفن ہیں جو اپنے وقت کے نامور عالم، محدث، فقیہہ، ادیب، مورخ اور اہل فضل و کمال تھے کہ جن کے طفیل یہ سرزمین مختلف سیاسی، مذہبی و روحانی اور ثقافتی تحریکات کا مرکز بنی کیونکہ "برصغیر میں مسلمانوں کی پہلی خود مختار ریاست منصورہ، کا قیام اسی بستی کے ایک شخص عبدالعزیز بن منذر کے سیاسی تدبر کا نتیجہ تھا"[۷]۔ اسی مقام پر پہلی مذہبی اور روحانی درس گاہ قائم ہوئی اور چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر میں یہاں ایسے دارالعلوم اور ایک ایسی خانقاہ کی بنیاد رکھی گئی جو اپنی نوعیت کی پہلی مثالی درس گاہ تھی۔ آج بھی سید صفی الدین گاذرونیؒ (وفات ۳۹۸ھ) کا مزار اس کی علمی و دینی عظمت رفتہ کا گواہ ہے۔ ملتان پر سلطان محمود غزنوی کے حملے کے بعد اوچ مسلمانوں کے ایک نیم مذہبی، نیم سیاسی فرقہ "قرامطہ" کی جائے پناہ اور دارالامان بن گیا اور رفتہ رفتہ اس نے ایک بہت بڑے علمی اور سیاسی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی جبکہ سندھ کے مشہور قبیلہ سومرہ نے جو قرامطہ کی دعوت کو قبول کر چکا تھا اوچ کی سیاسی و جغرافیائی حیثیت کی بنا پر اسے اپنا دارالحکومت مقرر کیا[۸]۔ اوچ اس دور میں ایک خوبصورت اور بڑا شہر تھا جو وسعت رقبہ اور کثرت آبادی کے اعتبار سے دہلی کا ہم پلہ بن گیا تھا[۹]۔ یہی وہ عہد زریں تھا جب اوچ نے برصغیر پاک و ہند کی تاریخ سازی میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا کیونکہ یہاں ایسے یگانہ روزگار اور باکمال لوگ جمع ہو چکے تھے جو اپنے علم و فضل اور تقویٰ و پرہیز گاری کے سبب بڑی شہرت کے مالک تھے۔ اس زمانے میں روحانی مرکز کی حیثیت سے خانقاہ گاذرونیہ اور تعلیمی لحاظ سے درس گاہ فیروزیہ کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ اسی خطے کا فیض تھا کہ "چچ نامہ" جو سندھ کے حالات پر پہلی مستند کتاب ہے، کا مرتب اور جامع اوچ ہی کا باشندہ تھا اور یہیں آسودہ خاک ہے۔ لباب الالباب کے مصنف محمد عوفی یہیں آکر اقامت پذیر ہوئے اور یہیں قیام پذیر رہ کر اپنے علمی کارناموں کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ غرضیکہ اوچ ایک ایسا مردم خیز خطہ ہے جس کی آغوش میں کتنے ہی نامور اہل علم و فضل اوج ثریا پر پہنچے۔ خواجہ فریدالدین گنج شکر نے اسی شہر میں حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشت (۱۴ شعبان ۷۰۷ھ ۔ ۱۰ ذی الحجہ ۷۸۵ھ) کے مزار سے ملحق مسجد حاجات میں ریاضت اور مجاہدہ کیا اور اسی سے ملحق کنویں میں نماز معکوس ادا کی اور مقام ولایت کے ابتدائی مراحل یہیں طے کئے۔ خواجہ نصیرالدین

محمود چراغ دہلوی نے بھی اوچ کی اسی مسجد میں چلہ کشی کی اور اعتکاف کیا۔ اس کے علاوہ برصغیر میں تصوف کا آفتاب پہلے پہل اس خطے پر طلوع ہوا جس سے گاذ رونیہ' بخاریہ اور سہروردیہ سلسلے کا قریبی تعلق تھا۔ مابعد ان ہی خانوادوں کے فیوض و برکات سے پورا برصغیر متمتع ہوا اور بیرون ہند تک اس کے اثرات پہنچے۔ اس طرح اوچ کم و بیش پانچ سو برس تک تصوف کے فلسفے کا منبع بنا رہا۔ اوچ کے بزرگان دین اور اولیاء و مشائخ کا کام صرف بندگان خدا کی اصلاح تک محدود نہ تھا بلکہ انہوں جہاں علمی و عملی فیض پہنچایا وہاں دوسری جانب جہاں کہیں مسلمان معتوب و مظلوم تھے اس جگہ پہنچ کر جہاد فی سبیل اللہ کی روایت کو از سر نو زندہ کیا۔

اوچ شہر میں موجود آثار قدیمہ عہد گم گشتہ کے اسلامی فن تعمیر کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ کئی ٹیلوں پر قبروں کے چہار اطراف پھیلے بیشتر مزارات ان بڑے بڑے اہل اللہ اور اصحاب طریقت کے ہیں جو اپنے اندر عروج و زوال کی کئی داستانیں سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہ علاقہ پرانے تاریخی آثار سے اٹا پڑا ہے۔ ان آثار قدیمہ میں دو عمارتیں ایسی ہیں جنہیں زمانہ قبل از تاریخ سے متعلق قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں مندر ہیں' جن میں ایک گوپی ناتھ جی اور دوسرا کھترپال جی کا مندر تھا[۱]۔ نیز یہاں ایک ایسے تالاب کا ذکر بھی ملتا ہے جسے کسی رانی نے کھدوایا تھا اور جس کی شکستہ عمارت کی از سر نو تعمیر راجا چچ برہمن کے عہد میں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ زمین میں دھنسی ہوئی بعض بوسیدہ دیواروں کا بھی سراغ ملتا ہے جو حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ (ولادت ۵۹۵ھ) کے مزار کے قریب چاروں اطراف دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ کسی دور میں دریائے گھاگھرا کے کنارے واقع ایک پرانے قلعے کی شکستہ فصیل تھی" یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اوچ شہر کی تعمیر اور تباہی میں فاتحین کے علاوہ دریائے گھاگھرا کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ بہرحال کبھی دریا کی طغیانی تو کبھی فاتح حکمرانوں کی نگاہ ہوس کے سبب یہ شہر بستا اور اجڑتا رہا۔ ٹیلے اونچے ہوتے گئے اور کھنڈرات کی تعداد بڑھتی گئی۔ پرانی عمارتوں کے ٹیلوں پر نئی عمارات تعمیر ہوتی رہیں اور ان عمارتوں سے جو ٹیلے بچے وہاں ایک شہر خموشاں آباد ہوتا گیا۔ اوچ کے سیاسی زوال نے ان عمارتوں کے نقش و نگار مسخ کر دیئے ہیں اور گردش زمانہ کے بے رحم ہاتھوں نے ان آثار کو اس طرح پیوند خاک کر دیا ہے کہ یہاں ہر سمت ویرانی ہی ویرانی ہے۔ قلعہ ہے تو دیواروں سے محروم اور دیواریں ہیں تو بام و در کا کوئی پتا ہی نہیں چلتا۔

اگرچہ اوچ شریف کی ظاہری شان و شوکت وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ معدوم پڑ چکی ہے اور اب یہ ایک معمولی سا قصبہ رہ گیا ہے لیکن اس تمام عرصہ کے دوران میں یہ خطہ ناقابل تغیر مذہبی تقدس کا حامل رہا ہے۔ آج بھی اس چھوٹے سے قصبے کو پاکستان میں مذہبی و ثقافتی قدر و منزلت کے اعتبار سے بہت وقعت حاصل ہے ایک دور میں یہاں حضرت صفی الدین گاذرونیؒ، حضرت جمال الدین قندھاریؒ، حضرت رضی الدین گنج عالمؒ، حضرت سید جلال الدین سرخ بخاریؒ، حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشتؒ، حضرت عبدالقادر جیلانی ثانیؒ جیسے بزرگ تشریف لائے اور یہاں مقیم ہو کر انہوں نے تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ لوگوں کو زندگی کے صوفیانہ انداز سے روشناس کرایا۔ ان شخصیات سے ملاقات کے اشتیاق میں شاہان وقت ان کے منتظر رہتے اور عوام روحانی تسکین اور دنیاوی دکھوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ان کے ارد گرد مجتمع رہے۔ بادشاہوں اور امرائے شہر نے ان کے صوفیانہ غور و فکر (مراقبہ) اور رسمی مذہبی تعلیم کی ترویج کے لئے مراکز کا اہتمام کیا۔ لہٰذا اس طرح بیک وقت یہ شہر مساجد، مدارس، مقابر، شاندار درگاہوں بشمول محلات اور بارہ دریوں جیسی ہمہ جہت قسم کی شاہی اور عوامی عمارات سے سج گیا۔ تاہم یہ بات حیران کن ہے کہ کسی ایک بھی سیاسی شخصیت یا بادشاہ کا مقبرہ اس شہرہ آفاق شہر میں نہیں، نہ ہی ان عمارات کا نشان ملتا ہے جو کسی زمانے میں خانقاہیں، سرائیں اور مدارس تھیں۔ علاوہ ازیں وہ عمارات جو مذہبی مقاصد سے ہٹ کر تعمیر ہوئیں وہ بھی عدم توجہی اور متعدد دیگر ضروریات اور کثرت استعمال کی وجہ سے معدوم ہو چکی ہیں تاہم مساجد اور مقبرہ جات تا حال اس قدیم علاقے کی روحانی اور دنیاوی یاد رفتہ کی پر شکوہ باقیات کے طور پر موجود ہیں۔ روائتی طور پر تقریباً" ہر اہم مقبرہ یا درگاہ اپنے جلو میں کوئی مسجد یا کم از کم ایک آدھ مصلیٰ ضرور لئے ہوئے ہے۔ سید جلال الدین سرخ بخاریؒ، حضرت جہانیاں جہانگشتؒ اور حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے مزارات سے ملحق مساجد فن تعمیر کا شاہکار ہیں اور اپنے سرپرستوں کی تدبیر اور عمدہ ذوق کی مثال ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عظیم معماروں کی بھرپور مہارت کو بھی ظاہر کرتی ہیں"[۳]۔

طرز تعمیر کے اعتبار سے اوچ کی پرشکوہ مذہبی عمارات کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی دور کی عمارات ان مقبروں کی ہیں جو نقشے کے لحاظ سے مربع یا مستطیل شکل میں ہیں۔ جن کی نشیبی مسطح چھتیں لکڑی کے فریموں اور ستواں ستونوں پر کھڑی کی گئیں ہیں اور ان عمارات کی

تعمیر میں مقامی فن تعمیر کی جھلک نظر آتی ہے جو روایتی ہونے کے ساتھ ساتھ جیومیٹری کے سادہ اصولوں پر مبنی تھا۔ اس طرز تعمیر میں وسط ایشیائی رنگ بھی نمایاں ہے جو برصغیر کے جنوب مغربی علاقوں میں بالخصوص مقبروں اور مساجد کی تعمیر کے لئے اختیار کیا گیا۔ ابتدائی دور میں بزرگان دین کے مزارات مربع یا مستطیل نما ڈھانچے پر کھڑے کئے گئے اور اوپر گنبد بھی بنائے گئے[۱۳]۔ جیسا کہ بہاول پور کے نواح میں موجود چھوٹی سی بستی آدم واہن میں حضرت شاہ گردیز' ملتان میں حضرت بہاء الدین ذکریا اور اوچ میں حضرت جلال الدین سرخ بخاری' حضرت ابو حنیفہ' حضرت جہانیاں جہانگشت اور حضرت راجن قتال کے مزارات پہلی قسم کی عمارات کے اہم نمونے ہیں۔ اس طرز کے اور بہت سے مزار موجود ہیں جو تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں پنجاب' سندھ اور بلوچستان کے کئی علاقوں میں تعمیر کئے گئے۔ دوسری قسم کی عمارات میں ایسے گنبد نما مقبرے شامل ہیں جو ہشت پہلو شکل کے ہیں جو حضرت بہاء الدین ذکریا کے بعد کے دور میں تعمیر ہونا شروع ہوئے۔ اس طرز تعمیر کے مزارات خوبصورت ہونے کے علاوہ فنی اعتبار سے تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مثلاً" ملتان میں حضرت شاہ رکن عالم اور حضرت علی اکبر (۱۵۸۵ء/۹۹۳ھ)' اوچ میں حضرت بہاؤالدین اوچی (جنہیں عموماً" بہاء الحلیم کے نام سے جانا جاتا ہے)' حضرت بی بی جیوندی (۱۴۹۴ء/۹۰۰ھ)' حضرت موسیٰ پاک شہید (۱۵۹۲ء/۱۰۰۱ھ)' دائرہ دین پناہ میں حضرت ابوالوہاب (۱۶۰۲ء/۱۰۱۱ھ) اور سیت پور میں طاہر خان نہڑ (۱۵۳۰ء/۹۳۷ھ) کے مزارات اس فن تعمیر کے شاہکار ہیں۔ ان مزارات کی عمارتوں کو تین منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور سب سے پہلا حصہ اس طرز کی عمارت کو مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے جو ہشت پہلو ہونے کے سبب اسلامی فن تعمیر میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے[۱۴]۔

مسطح چھتوں والے مربع یا مستطیل شکل کے اینٹوں والے مقبرے نہایت شاندار ہیں جنہیں روغنی ٹائیلوں' پچی کاری' لکڑی کے نقش و نگار والے کام اور وارنش کے اعلیٰ کام سے مزین کیا گیا۔ شکل کے اعتبار سے ایسے مقبرے قبوں والے مزارات کے مقابلے میں ایک دوسرے سے زیادہ مماثلت رکھتے ہیں (شکلی مماثلت رکھنے والے ایسے مقبرے قبوں والے مزارات سے زیادہ عام نظر آتے ہیں) اوچ میں مروج اس قسم کا طرز تعمیر طویل عرصے تک مقبول رہا۔ اس قدیم شہر میں فن تعمیر کے ایسے نمونوں کی افراط اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس میں ترجیح — زیادہ مقبولیت کا عمل دخل تھا۔ اس

طرز کی عمارات کی تعمیر میں استعمال ہونے والے سامان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قدرے کم پائیدار نوعیت کا تھا۔ نسبتاً" کم چوڑی دیواریں، لکڑی کے فریموں والی مسطح چھتیں اپنی ساخت کے اعتبار سے طویل عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان عمارات میں سے بیشتر منہدم ہو چکی ہیں۔ جبکہ دوسری بہت سی عمارتوں کی مرمت ان کی اصل صورت کے مطابق کی گئی ہے۔ اینٹوں سے تعمیر کردہ ان منفرد عمارتوں کی تعمیر میں چونے اور گارے کا استعمال کیا گیا جبکہ ان کی چھتیں لکڑی کے فریموں پر قائم ہیں جو کہ مربع یا گول شکل کے دو، تین یا چار رویہ ستونوں کی ترکیب پر مشتمل ہیں۔ ستونوں کے اس سلسلے پر ڈھلوان دار بیم والی چھتیں اور ان کے باقی ماندہ حصے ہیں اور چھت کو سہارنے والے شہتیر (بیم) استوار ستونوں اور بریکٹوں کے ذریعے قائم ہیں۔ لکڑی کے تختے اور ان پر ٹائیلوں کا کام چھت کو مضبوط بناتے ہیں۔ لکڑی کی چھت کا اندرونی ڈھانچہ بڑی محنت کے ساتھ سرخ، زرد اور سفید پختہ رنگوں کے پھولوں والے نمونوں سے مزین کیا گیا ہے۔ جبکہ بیرونی اور بعض جگھوں پر اندرونی دیواروں کی تزئین پچی کاری والی ٹائیلوں یا (ڈیزائینوں کی شکل میں) کٹی ہوئی اینٹوں سے کی گئی ہے۔ عمارات کی جنوب مشرقی سمت میں واقع داخلی دروازے کا چوکھٹا نفیس کٹائی والے ڈیزائین کا ہے جس کے کواڑوں کے اوپر والے حصے کو تاج کی طرح گھنٹیوں کی شکل کے لٹکے دو رویہ آرائشی کنگروں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اصل داخلی راستے کے بالمقابل ایک ہموار چھت والا برآمدہ لکڑی کے ڈھانچے پر استوار کیا گیا ہے۔ جبکہ دیواروں کے اوپر ہوا کی آمد و رفت کے لئے مستطیل شکل کے سوراخ ہیں جن میں نہایت نفیس اور منقش کام والی لکڑی کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ چھت پر لکڑی کے کام کے سب سے اعلیٰ نمونے حضرت صفی الدین گاذرونی اور حضرت جہانیاں جہانگشت کے مزارات پر ملتے ہیں۔ پچی کاری والی ٹائیلوں اور لکڑی کو نفیس انداز میں تراش کر تیار کی گئی جالیوں والے عمدہ نمونے حضرت راجن قتال کے مقبرے پر ملتے ہیں۔ درج بالا دونوں تعمیراتی کاموں میں چاہے وہ ڈیزائین دار اینٹوں کا ہو یا منقش کام والی لکڑی کا جیومیٹری کے اصولوں کو ملحوظ رکھ کر بنایا گیا ہے یہ تمام تعمیر و تزئین مقبرہ سازی سے متعلق کاریگری کے نمونوں کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔ ان میں سے اکثر مقبروں کو انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران مرمت کے ذریعے اصل حالت میں لایا گیا ہے اور زیادہ تر مقبرے اپنے اصل نقشوں پر قائم ہیں۔ حضرت ابوحنیفہ کا مزار جو مرمت نہ ہونے کے سبب تاحال اپنی اصل حالت میں

ہے۔ اگرچہ تشویش ناک حد تک شکست و ریخت سے دوچار ہے۔ مگر پھر بھی اپنی بنیادوں پر قائم ہے۔ اوچ شریف میں سیدھی چھتوں والے مقبروں کے درمیان پانچ ایسے مزارات ہیں جو کہکشاں کا سا منظر پیش کر کے زیارت کے لئے آنے والے ہر فرد کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دیتے ہیں۔ جس سے معماروں کی عظمت فن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان میں سے تین شکستہ ترین گنبدوں والی درگاہیں شہر کے جنوب مغربی حصے میں اونچے ٹیلے پر واقع ہیں، جو کسی قدیم قلعے کے آثار کا پتا دیتا ہے، جس پر اب ایک وسیع قبرستان بن چکا ہے۔ مذکورہ بالا تعمیراتی کام کا مطالعہ نہ صرف پاکستان میں مسلمانوں کے قدیم فن تعمیر کے جائزے کے لئے ضروری ہے بلکہ فن تعمیر میں آرائش و زیبائش کے نقطہ نظر سے بھی خاصا اہمیت کا حامل ہے[۱۵]۔

درج بالا تینوں مقابر میں سے قدیم ترین مقبرہ حضرت بہاء الدین اوچی کا ہے۔ آپ حضرت جہانیاں جہانگشت کے استاد اور اپنے زمانے کے بڑے عالم تھے۔ یہ مقبرہ حضرت جہانیاں جہانگشت کے زمانے میں تیار ہوا۔ جو نفیس کام، خوبصورتی اور پائیداری کا عمدہ نمونہ تھا مگر دریائے گھاگھرا کی تند و تیز لہروں نے اس کا ایک حصہ مسمار کر دیا۔ اس مقبرے میں ملتانی کاشی کاری کا بڑا عمدہ کام ہوا ہے جبکہ ٹھٹھہ کے فن تعمیر کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے جہاں حضرت مخدوم ایک عرصے تک قیام پذیر رہے تھے[۱۶] اس مزار کا ایک حصہ نفیس نقش و نگار والی ٹائیلوں سے مرصع ہے جسے دندانے دار آرائشی کنگروں کے ذریعے تیار کیا گیا ہے۔ باقی ماندہ اندرونی حصے پر چونے کے چمکدار پلاسٹر کا کام ہے۔ بالائی حصے پر چوڑے مستطیل نما تختوں کا سلسلہ ایک سیدھ میں موجود ہے جنہیں خالی جگہوں پر علی الترتیب زیریں تختوں کے اوپر بنایا گیا ہے۔ ہشت پہلو منزل کو تقریباً" سولہ کونوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو عمارت کے ہر حصے کو علیحدہ کرتے ہیں۔ ہر حصے کو الگ کرنے کے لئے ایسی محرابیں بنائی گئی ہیں جنہیں لکڑی کے بیم سہارا دیتے ہیں۔ یہ بیم گھنٹی کی شکل کے بریکٹوں پر کھڑے ہیں قبے کی بنیاد کو لکڑی کے حلقے پر کھڑا کیا گیا ہے جسے گھنٹی نما بریکٹوں پر سہارا دیا گیا ہے[۱۷]۔ اگرچہ بہاء الدین اوچی کی تاریخ پیدائش کا صحیح علم نہیں لیکن آپ کے شاگرد کی تاریخ پیدائش (۱۳۰۷ء/۷۰۷ھ) اور تاریخ وفات (۱۳۸۳ء/۷۸۵ھ) سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس بزرگ شخصیت نے اپنے استاد کا مزار اس عرصے میں تعمیر کروایا جب ان کا قیام اوچ میں تھا۔

اوچ کے نادر نمونے اپنی مقبولیت کی لازوال یاد کے طور پر باقی ہیں جو دراصل وسط ایشیائی ثقافت کی ایک ایسی جھلک ہیں جس میں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ کچھ نئی اختراعات اور اضافے بھی ہوئے ہیں جنہیں طرز تعمیر کی مقامی تبدیلیوں کا نام دیا جا سکتا ہے۔ بی بی جیوندی (وفات ۸۰۵ھ) کا مقبرہ اسی سلسلے کی سب سے بڑی آرائش و زیبائش والی عمارت ہے۔ یہ عابد و زاہد اور صالحہ خاتون حضرت سید جلال بن سید حمید کی دختر عالیہ تھیں۔ آپ کے مقبرے کی عمارت ۱۴۹۴ء میں خراسان کے بادشاہ محمد دلشاد نے تیار کروائی تھی[۱۸]۔ اس شاندار مقبرے کا نصف حصہ ۱۳۳۳ھ میں دریا کی طغیانی کی نذر ہو گیا تھا۔ اس مقبرے کی بنیاد مثمن طرز کی ہے۔ اس کی اطراف پیمائش میں ۳۴ فٹ ۹ انچ ہیں۔ نہایت ہی نمایاں انداز میں استوار دیواریں ۲۷ فٹ ۹ انچ بلند اور ۱۲ فٹ ساڑھے سات انچ موٹی ہیں جنہیں مزید پشتہ بندی سے مضبوط بنایا گیا ہے۔ مزار کا محیط رفتہ رفتہ اوپر جا کر کم ہو جاتا ہے جبکہ قبہ کو کلس کے ذریعے مزین کیا گیا ہے۔ مقبرہ کے اندرونی اور بیرونی حصے کو آرائش اور گلکاری کے کام سے آراستہ کیا گیا ہے۔ عمارت کا نیچے والا حصہ منڈیر کی شکل میں روغنی ٹائیلوں سے، جن پر لفظ "اللہ" کندہ ہے، سجایا گیا ہے۔ مثمن انداز سے مقبرہ کی تمام اطراف قدرے باہر کی طرف جھکاؤ رکھتے ہوئے مستطیل شکل کے تختے کی صورت پیدا کرتی ہیں جو مقبرے کی بناوٹ کے ساتھ ساتھ اس کے آرائشی مقصد کو بھی پورا کرتی ہیں۔ اوپر والا تختہ بڑی سادگی سے آراستہ کیا گیا ہے جسے متوازی حاشے کے اندر قدرے جگہ چھوڑ کر بنایا گیا ہے۔ اس کے بالائی حصے کے دندانے دار آرائشی کام سے مزین کیا گیا ہے۔ محرابوں کے اندرونی حصوں کو مختلف حجم کی متعدد نمونوں کی گلکاری والی روغنی ٹائیلوں کے آرائشی کنگرں سے دلکش بنایا گیا ہے۔ برجیوں کو چوڑے پتوں کے گچھے کی شکل میں، جو باہر کی طرف نکلے ہوئے ہیں، دلکش بنایا گیا ہے[۱۹]۔ جیسا کہ پہلی ہشت پہلو منزل ۲۷ فٹ ۹ انچ بلندی پر استوار کی گئی ہے اس کے اوپر دوسری کم حجم والی ہشت پہلو منزل تیار کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ مقابلتاً کم محیط کی ہے لہٰذا یہ پہلی منزل کے اختتام تک تنگ گھیرا رکھتی ہے۔ دراصل یہ منزل ایک بلند بیلن نما شکل میں تعمیر کی گئی ہے جس پر قبہ رکھا گیا ہے۔ پہلی منزل کی طرح اس کی تزئین بھی نفیس اور باریک آرائش والی روغنی اور گلکاری شدہ ٹائیلوں سے کی گئی ہے۔ اس کی منڈیر کو بھی دندانے دار کنگروں سے سجایا گیا ہے۔ نچلی منزل کی طرح اس میں بھی ہوا کے لئے دریچے رکھے گئے ہیں۔ مقبرے کے کونوں کو گلکاری شدہ روغنی

رنگ دار ٹائیلوں کی رو سے مرصع کیا گیا ہے جبکہ باقی ماندہ سطح پر سفید روغنی ٹائیلیس لگائی گئی ہیں۔ مقبرے کا اندرونی حصہ بھی بے مثل آرائش و زیبائش کا منظر پیش کرتا ہے۔ یہاں ڈیزائن دار اینٹوں کا انتہائی باریک کام چمکدار پلاسٹر اور چوبی کام افسانوی انداز سے دل کو لبھاتا ہے[۲۰]۔ اس مقبرے کے معمار کا مزار بھی یہیں قریب ہی واقع ہے جسے اس قسم کے مقبروں میں تیسرا مقبرہ شمار کیا جاتا ہے[۲۱]۔

حضرت ابوحنیفہ کا مقبرہ مرمت نہ ہونے کے سبب اپنی اصلی حالت میں موجود ہے جسے گچ کاری کا بہترین نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر کے لئے اچھی طرح پکی ہوئی سرخ رنگ کی ٹائلیں استعمال کی گئیں ہیں جن کی لمبائی ۸ انچ چوڑائی ۵ انچ اور موٹائی ایک انچ ہے۔ ان ٹائیلوں کو ضرورت کے مطابق کاٹ اور صاف کر کے نصب کیا گیا ہے۔ عمارت کی چاروں دیواریں معمولی اندرونی جانب جھکی ہوئی ہیں اور شرقی غربی اور جنوبی اطراف میں باہر کی جانب مستطیل نما محراب رکھی گئی ہے۔ بیرونی سطح کو مجموعی طور پر نمائشی کنگروں اور پختہ رنگوں سے مزین نقاشی والے تختوں اور پچی کاری والی اینٹوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ جبکہ اس کے حاشیہ کو کٹی ہوئی آراستہ شدہ ٹائیلوں سے مزین کیا گیا ہے۔ ان کے اندر چوکور شکل میں رنگ دار ٹائیلیں ہشت پہلوی انداز میں جیومیٹری کے اصولوں کے تحت لگائی گئی ہیں۔ اس مسطح آراستہ حاشیئے کے اندر مزید محرابی مستطیل نما چوکھٹے ہیں جو محراب دار حصے کو مربع شکل کی روغنی ٹائیلوں کے ذریعے مرصع کرتے ہیں۔ درمیانی فاصلے کو تکونی شکل کی روغنی ٹائیلوں سے مکمل کیا گیا ہے جس کا ڈیزائن ملحقہ حاشیئے سے ملتا جلتا ہے۔ اوپر والے حصے کو نمائشی کنگروں سے سجایا گیا ہے اور منڈیر کو واضح طور پر روغنی اینٹوں اور ٹائیلوں سے مزین کیا گیا ہے اور چوکھٹے پر آرائشی کنگروں اور (V) شکل کے دندانوں کا تاج بنایا گیا ہے۔ یہ تمام کام حاشیے کی سطح تک ہے۔ اس حاشیے پر روغنی اینٹوں کے پلنگ بنے ہوئے ہیں اور اس سے اوپر چپٹی اینٹوں کی سطح تک متوازی نمائشی کنگروں کا سلسلہ ہے۔ بالائی اور نچلے آرائشی کنگرے جو ایک ایسی مسلسل سیدھ کی شکل میں حاشیہ فراہم کرتے ہیں جس میں اوپر نیچے دو تکونیں رکھی گئی ہیں۔ درمیان والے کنگرے مربع شکل کی رنگین اور روغنی ٹائیلوں سے تیار کئے گئے ہیں جو حسب معمول باہم متصل ہشت پہلو نمونے کے ہیں۔ اوپر دو مختلف حجم کے افقی تختے درمیانی ڈھانچے کے پہلو میں واقع ہیں۔ ان کے وسط میں ہوا کی آمد و رفت کے لئے مربع شکل کے سوراخ ہیں جنہیں سرخی مائل پکائی ہوئی مٹی کی جالیوں سے بند کیا ہوا ہے۔ اس نمائشی کنگرے کے اوپر

ایک اور ملی جلی قسم کا کنگرا ہے جو تین سطور پر مشتمل ہے۔ اس سے اوپر پھر مزین ٹائیلوں کا کام موجود ہے۔ مقبرے کے جنوبی حصے کو مختلف حجم (سائز) کے محرابی منقش تختوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کی منڈیر اسی طرح کا زیبائشی انداز رکھتی ہے جس طرح دوسری اطراف کی جانب ہے۔ مغربی دیوار کے اندرونی جانب محراب رکھی گئی ہے جو گہری محرابی شکل کا ایک خلا ہے۔ اس کی اطراف روغنی چمکدار رنگ کی مٹی کے کام اور پچی کاری والے آرائشی تختوں سے خوبصورتی کے ساتھ سجی ہوئی ہیں[۲۲]۔

درج بالا شاندار فنی تعمیری مہارت کے شاہکار مزارات کے علاوہ حضرت جلال الدین سرخ بخاری کا مزار بھی سادگی اور پرکاری کا بہترین نمونہ ہے جسے ۱۰۲۶ھ میں مخدوم حامد نوبہار اول نے بنوایا اور ۱۳۶۱ھ میں بہاول پور کے فرمانروا نواب محمد بہاول خان عباسی ثانی نے یہاں ایک خوبصورت عمارت بنوائی۔ یہیں آپ کے فرزند حضرت سید احمد کبیر کا مزار بھی ہے۔ اوچ بخاری کے شمال میں حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشت اور ان کے چھوٹے بھائی مخدوم صدرالدین راجن قتال کے مزارات دو علیحدہ علیحدہ عمارتوں میں واقع ہیں۔ دونوں عمارتوں پر ملتانی کاشی کاری کا بہت نفیس کام ہوا ہے جس کی تفصیل مسطح چھتیوں والے مقبروں میں پیش کی جا چکی ہے۔ اوچ گیلانی میں حضرت سید محمد غوث کا مزار بھی خوبصورتی اور دلکشی کے اعتبار سے ملتانی فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ پہلے یہ عمارت گنبد کے نمونے پر تھی لیکن بعد ازاں اسے ضرورتاً وسیع کیا گیا اور اس کے اوپر ہموار چھت ڈال دی گئی۔ اس مقبرے میں اپنے والد ماجد کے پہلو میں سید عبدالقادر ثانی بھی آسودہ خاک ہیں۔ اس کے علاوہ قطب الدین لنگاہ والئی ملتان و اوچ کا مزار بھی اسی عمارت میں واقع ہے۔ مخدوم سید فضل علی نے سندھ کے حکمران غلام شاہ کلہوڑہ کی امداد و اعانت سے یہاں ایک قلعہ تعمیر کروایا تھا۔ یہ قلعہ تو مسمار ہو گیا مگر اس کا ایک دروازہ آج بھی موجود ہے جسے ہاتھی دروازہ کہا جاتا ہے۔ اوچ گیلانی کے مشرقی جانب حضرت سید کبیر الدین حسن دریا کا روضہ بھی بڑا خوبصورت بنا ہوا ہے جس کا گنبد دور سے نظر آتا ہے۔ اوچ جمالی میں بھی کئی آثار شکستہ حالت میں موجود ہیں۔ یہاں حضرت شیخ جمال خنداں رو اور ان کے فرزند گرامی حضرت رضی الدین گنج عالم کا مزار واقع ہے۔ اس مزار سے متصل ایک قدیم شہر کے کھنڈرات موجود ہیں جو خانقاہ جمالیہ کے دور عروج کی بچی کھچی یادگاریں ہیں۔[۲۳]

اگرچہ خطہ پاک اوچ اپنے مقبروں والی عمارات کی وجہ سے مشہور ہے تاہم مقبرہ جات کے ساتھ

ساتھ مساجد کو کسی تغیر و تبدل کے ان مقبروں کے لازمی متعلقات کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بزرگان دین کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لئے آنے والے زائرین نماز کی ادائیگی کے لئے قریبی مساجد کا رخ کرتے ہوں گے۔ اس تناظر میں اس بات کا تعین کرنا آسان ہے کہ اوچ شریف میں تقریباً" تمام بڑے اہم مزارات سے ملحق مساجد ہیں۔ لیکن یہاں پر موجود مقبرہ جات اور درگاہوں کی طرح ان مساجد میں سے بیشتر مرمت و تاسیس اور از سر نو تعمیر کے مراحل سے گذر چکی ہیں۔ حضرت جلال الدین سرخ ' حضرت جہانیاں جہانگشت' حضرت سید محمد غوث اور دوسرے مقبرہ جات سے ملحق مساجد اس سلسلے کی اہم مثالیں ہیں۔ ان مقبرہ جات کی طرح پہلی دو مساجد ہموار چھتوں والی ہیں جبکہ تیسری مسجد تین قبوں والی ہے۔ حضرت جلال الدین سرخ کے مزار سے متصل مسجد بہت خوبصورت ہے جس کی منقش چھت ملتانی کاشی گری کا نادر نمونہ ہے۔ قبے کی بجائے لکڑی کی چھت بنائی گئی ہے جس میں دائیں طرف طلبہ کے لئے دو منزلہ حجرے تعمیر کئے گئے تھے۔ صحن میں ایک پختہ تالاب ہے[۲۴]۔ مسجد میں نصب کتبے کے مطابق اس مسجد کی مرمت شیخ حمید کے حکم پر ملا احمد نے ۱۶۱۷ء / ۱۰۲۷ھ میں کی[۲۵]۔ حضرت جہانیاں جہانگشت کے مقبرے سے متصل مسجد بھی بعض نمایاں خصوصیات کی مالک ہے اس مسجد کے دروازوں کے تختے لکڑی کے ہیں جن پر جالیاں بنی ہوئی ہیں۔ غربی دیوار کے وسط میں محراب ہے جس میں مصلیٰ کے لئے خاصی جگہ چھوڑی گئی ہے۔ محراب کے سامنے والے حصے کو چوبی فریم سے سجایا گیا ہے اور بالائی حصہ خمدار انداز میں اینٹوں سے پاٹ دیا گیا ہے۔ بالائی محرابی حصے کو ٹائیلوں کی ڈاٹ کے ذریعے تعمیر کیا گیا ہے جو اس حصے کے لئے علیحدہ سے چھت کا کام دیتا ہے۔ یہ محرابی چھت روغنی ٹائیلوں سے آراستہ ہے جس میں کاشی کاری کے ذریعے بھرپور طور پر کھلے ہوئے کنول کے پھول اپنی بارہ نمایاں پتیوں اور ابھرواں بیج دار مرکزی حصہ کے ساتھ واضح کئے گئے ہیں۔ اس محراب کی اطراف میں دو مستطیل نما روشندان ہیں جنہیں ایسے چوبی دریچوں سے بند کیا گیا ہے جو لکڑی کے نفیس بیل بوٹوں سے آراستہ ہیں۔ محراب میں لکڑی کے آرائشی فریموں اور خشتی ٹائیلوں کا کام ہمارے سامنے پاک پتن میں شیخ علاؤالدین کے مزار کی محراب کا نمونہ پیش کرتا ہے جس کی مرمت نئے سرے سے کی گئی ہے[۲۶]۔ اس قدیم العہد مسجد کو مسجد حاجات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس مسجد کے شمال مشرقی کونے میں وہ تاریخی کنواں ہے جس کے بارے میں ابتداء میں بیان کیا گیا ہے کہ

خانوادہ چشتیہ کے صوفی بزرگ حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر نے نماز معکوس ادا کی تھی[۲۷]۔ درگاہ گیلانیہ اوچ شریف کی جامع مسجد بھی ایک قدیم خوبصورت تاریخی مسجد ہے۔ تین قبوں والی اس مسجد کی تزئین میں دربار عالیہ سے عقیدت کا رنگ جھلکتا ہے[۲۸]۔

اوچ کے فن تعمیر کا عمیق جائزہ لینے کے بعد یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہاں قبوں والے مزارات اپنی تعمیری خصوصیات کے اعتبار سے ملتانی فن تعمیر سے قریبی مماثلت رکھتے ہیں جبکہ اس طرز تعمیر کا رواج جنوبی پنجاب میں بالخصوص وسط ایشیا سے سیاسی و ثقافتی تعلقات اور روابط کی وجہ سے ہوا جس کا آغاز محمود غزنوی کے حملوں سے ہوا اور بعد ازاں منگولوں کے حملے اس خطے میں سلجوقیوں کی نقل مکانی کا سبب بنے[۲۹]۔ وسط ایشیا کے علاقوں سے یہ تعلق یک طرفہ نہ تھا بلکہ زمانہ امن میں برصغیر کے لوگ ان علاقوں میں حصول علم اور تجارتی مقاصد کے لئے جاتے رہے۔ اس طرح مختلف تہذیبوں کے باہم ملنے سے ملتانی طرز تعمیر نے فروغ پایا[۳۰]۔ اس انداز تعمیر کا قدیم نمونہ بلوچستان میں بیلا کے مقام پر ملتا ہے۔ مربع نما شکل کے اس مقبرہ میں محمد بن قاسم کی فوج کے ایک جنرل محمد بن ہارون مدفون ہیں تاہم اس کی تصدیق کسی تحریری یا نقاشی کے نمونے سے ثابت نہیں۔ اسلوب کے اعتبار سے یہ عمارت بعد کے زمانے کی معلوم ہوتی ہے جس میں سلجوقی طرز تعمیر کے اثرات نمایاں ہیں۔ مثلاً" مثمن طرز کی قبہ والی عمارت جس کا ہر زاویہ بنیادوں کی سطح سے ہی آگے کی جانب نکلا ہوا ہے اور گنبد کی گولائی کو خوشنمائی کے ساتھ استوار کرنے کے لئے خاص وسط ایشیائی فن اختیار کیا گیا ہے[۳۱] اسی طرح آدم واہن میں موجود حضرت شاہ گردیز کا مقبرہ تعمیراتی اسلوب کا بہترین نمونہ ہے اگرچہ اسے خام اینٹوں سے بنایا گیا ہے۔ پورے مقبرے کو تین منزلہ مربع نما شکل کی چبوترہ نما بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ عمارت کا ہر بیرونی پہلو باقاعدہ طور پر محرابوں پر قائم ہے جس کے اوپر ایک بلند بیلن تعمیر کرنے کے بعد اس پر نصف کرہ کا قبہ بنا دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ عمارت شکستگی کا شکار ہے لیکن طرز تعمیر مطالعے کے لئے دلچسپ مواد فراہم کرتی ہے[۳۲] اور یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ درج بالا مقبرے کی تعمیر کے ابتدائی تجربہ کے بعد ہی ملتان اور اوچ میں اس طرز کے مقبروں کی تعمیر عمل میں آئی۔ جیسے مابعد عمارت کے زاویوں کو باہر نکال کر مربع نما شکل کے تین منزلہ ہشت پہلو انداز میں تبدیل کیا گیا۔ جیسا کہ ۱۳۲۰ء سے ۱۳۲۵ء کے درمیانی عرصہ میں معماروں نے حضرت شاہ رکن عالم اور مابعد شیخ بہاء

الدین اور حضرت بی بی جیوندی کے مزارات کو ہشت پہلو طرز تعمیر کے تحت تیار کیا۔ بلاشبہ یہ مقابر فن تعمیر کی اعلیٰ خوبیوں کے سبب برصغیرپاک و ہند اور وسط ایشیا کے شاہکار کے طور پر سامنے آئے۔ جہاں ان مزارات سے جلال و شکوہ کے آثار جھلکتے ہیں وہاں تعمیری مضبوطی، تنوع اور خوبصورت آرائش و زیبائش کے تمام تر اوصاف بیک وقت نظر آتے ہیں۔ مزید برآں ان عمارات میں پہلی بار نہایت ماہرانہ انداز سے خشتی کام کے ساتھ ساتھ چوبی فریموں اور ساسنوں کا متوازی کام دیکھنے کو ملتا ہے[۳۳]۔

اوچ کی ان یادگار عمارات میں روغنی ٹائیلوں کا نفیس اور منقش کام اس قدر دلفریب انداز رکھتا ہے کہ اس کے بغیر کوئی بھی شاہکار عمارت اس فن تعمیر سے ہم آہنگی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک اچھوتا اسلوب ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ اس خطے میں پنپتا رہا۔ فن تعمیر میں آرائش اور زیبائش کی یہ پختگی یہاں کے کاریگروں کی مہارت کا ایک بڑا ثبوت ہے۔ اس وقت کے ماہرین فن تعمیر بنیادی طور پر تین قسم کی روغنی ٹائیلیں استعمال کرتے تھے یعنی مسطح شکل کی، مربع یا مستطیل شکل کی خوب آگ میں پکا کر تیار کی گئی ٹائیلیں جنہیں مختلف رنگوں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ جس میں ایرانی طرز کا نیلا اور سفید رنگ نمایاں ہے۔ ان پکائی ہوئی ٹائیلوں پر نیلے اور سفید شکل کے پھول اور پتوں کے ڈیزائن مثبت کاری کے ذریعے بنے ہوئے ہیں[۳۴]۔ اور اس طرح یہاں ٹیرا کوٹا طریقے پر نیلے اور سفید رنگوں کے موٹے کونوں والے بلگ بنا کر سوراخ دار جالیاں بنائی گئی ہیں۔ پہلی قسم کا انداز بلا تخصیص عمارت کی بیرونی سطح کو مرصع کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے جبکہ دوسرا طریقہ صرف منڈیر کی آرائش و زیبائش تک مخصوص ہے۔ جبکہ تیسرا طریقہ حاشیوں اور مثلثوں کی سجاوٹ میں استعمال ہوا ہے۔ دوسری قسم کا بہترین نمونہ حضرت ابوحنیفہ حضرت جہانیاں جہانگشت حضرت صدرالدین راجن قتال اور حضرت صفی الدین گاذرونی کے مزارات میں ملتا ہے۔ مزید برآں آرائش و زیبائش کے لئے مثلث اور مربع طرز کی ٹائیلوں میں جیومیٹری کے اصولوں کے تحت پھولوں والی ایسی اشکال وضع کی گئی ہیں جو دلچسپ دائروں اور کثیر الاضلاع اجسام پر مشتمل ہیں جنہیں ''ٹیرا کوٹا'' طریقے پر تیار کی گئی ٹائیلوں سے بنایا گیا ہے۔ ان نمونہ جات کی بہترین مثالیں ایسی مثلث نما ٹائیلوں پر دستیاب ہیں جو حضرت ابوحنیفہ کے مقبرے کی منڈیر پر مزین کرنے کے لئے استعمال کی گئی ہیں۔ یہ آرائشی اشکال مورچھل جیسی ہیں جنہیں مرصع دھاگوں سے لٹکے ہوئے دکھایا گیا ہے[۳۵]۔ یہاں یہ بیان کرنا ضروری

ہے کہ ایسے ڈیزائن اوچ سے باہر دیکھنے کو نہیں ملتے۔

اوچ کے شاہکار مقبروں کی تعمیر میں عمدہ لکڑی کا استعمال بھی کیا گیا ہے جس کا مقصد نہ صرف آرائش و زیبائش تک محدود تھا بلکہ عمارت میں لچک کو سہارنے کی طاقت بھی پیدا کرتا تھا۔ اولین مقصد کے لئے لکڑی کی کامدار جالیاں ہوا کی آمدورفت کے لئے رکھی گئیں جبکہ دوسرے مقصد کے حصول کے لئے متوازی حالت میں لکڑی کے بیم عمارت کی بنیادوں میں اور دیواروں کی تعمیر کے دوران مختلف وقفوں سے مضبوطی اور لچک پیدا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھتوں میں لکڑی کے تختے استعمال کئے گئے ہیں۔ یہاں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان شاندار عمارتوں کی تعمیر میں لکڑی کا استعمال بیرونی فن تعمیر خصوصاً" وسط ایشیا کے اثرات کی وجہ سے پہنچا جہاں یہ قدیم دور سے مقبول تھا۔ لیکن اس کے علاوہ اوچ میں لکڑی کے زیادہ استعمال میں مقامی ترجیحات کا عنصر بھی جھلکتا ہے۔ مسطح چھتوں والے مزارات میں چوبی کام کا استعمال بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں مربع یا مستطیل نما عمارتوں کی چھتیں چوبی ڈھانچے والی ہیں جنہیں گول یا مربع شکل کے ستونوں کی دو، تین یا چار قطاروں کے ذریعے استوار کیا گیا ہے۔ اسی طرح چھت کو سہارا دینے کے لئے لکڑی کے بیم اور سہارا دینے والی بریکٹیں خوبصورت انداز میں ترتیب دی گئی ہیں۔ لکڑی کے اس نفیس کام پر سرخ، زرد اور سفید وارنش کر کے خوبصورت بیل بوٹوں سے مزین کیا گیا ہے۔ جبکہ چھت لکڑی کے جن ستونوں اور ٹیکیوں (بریکٹوں) پر کھڑی ہے ان پر بھی نقاشی کا اعلیٰ کام کیا گیا ہے[۳۶]۔ خلاصہ بحث یہ کہ درج مقابر اور مساجد مستقبل کے معماروں کے لئے یقیناً" ایک بھرپور نمونہ ہیں جن کی گذشتہ چھ صدیوں سے نقل کی جا رہی ہے۔ کیونکہ یہ وہ لازوال نمونے ہیں جن کی مقبولیت اور عظمت کو مغلوں کی عظیم الشان عمارات بھی کم نہیں کر سکیں اور اس نمونے کے تقریباً" دو درجن کے لگ بھگ مزارات اس وقت پاکستان کی سرزمین پر موجود ہیں۔

یہ مقابر، مساجد اور خانقاہیں محض ماضی کے کھنڈرات ہی نہیں بلکہ ہماری گذشتہ نسلوں کے مذہبی رجحانات کے عکاس، بزرگوں سے والہانہ عقیدت کے مظہر، ان کی صناعی و تخلیقی صلاحیت کے نادر نمونے اور اس بات کے گواہ ہیں کہ قرون اولیٰ کے مسلمان بلند عزائم، اعلیٰ افکار اور بیش بہا تعمیری صلاحیت کے مالک تھے۔ وہ جدت پسندی میں یکتا، حفظان صحت کے اصولوں سے آگاہ اور فن تعمیر کی خصوصیات سے واقف تھے۔ یہ تعمیری پائیداری کا نتیجہ تھا کہ اقتدار زمانہ کے بے رحم تھپیڑوں کے باوجود

یہ عمارتیں آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ فن تعمیر کے یہ نادر الوجود شاہکار اور بے مثل نمونے ہمارا ثقافتی ورثہ ہیں ایسا ورثہ جو شاندار ماضی سے آگاہ اور بہتر مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ ہمارے قوائے عمل میں ہل من مزید کی امنگ پیدا کرتا ہے۔ یہ ہمارے انداز فکر کو نئی راہوں اور نئی جہتوں سے روشناس کراتا ہے۔ یہ ہمارے بزرگوں کے مسکن اور رہنماؤں کے مقابر ہیں۔ اس سے نہ صرف ہمیں ان عظیم ہستیوں کا پتا چلتا ہے جنہوں نے اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا بلکہ ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ جو لوگ اللہ کی رضا کے لئے کوشش کرتے ہیں اللہ رب العزت ان کو حیات جاوید عطا کرتا ہے۔ ان مقابر کو محفوظ کرنے اور آنے والی نسلوں کے لئے قائم رکھنے کی خاطر یہ ضروری ہے کہ کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں اس کے لئے آثار قدیمہ کے ماہرین کو چاہئے کہ ان مقابر' مساجد اور خانقاہوں کی تعمیر کے کچھ نمونے تجربہ گاہوں میں تحقیق کی غرض سے بھیجیں تاکہ ان مقبروں کے شکستہ حصوں کو حقیقی شکل میں تعمیر کیا جا سکے۔ قیمتی نوادرات کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔ یہ تاریخی عمارتیں جن وجوہ سے شکستہ ہو رہی ہیں ان کا خاطر خواہ سدباب کیا جائے۔ اگر کسی مقام پر کوئی تاریخی عمارت کسی کی ذاتی ملکیت میں ہے تو اسے ہر قیمت پر حاصل کر کے قومی ملکیت قرار دیا جائے نیز مقابر اور صاحب قبر کے بارے میں کوئی نادر شے اگر کسی کی ملکیت میں ہو تو اسے حاصل کیا جائے۔ مقابر' صاحب قبر یا عمارت سے متعلق مخطوطات' کتبات یا کسی بھی متعلقہ ثبوت کا پتا چلے تو اس کو حاصل کیا جائے تاکہ تمام ممکنہ اشیاء و دستاویزات محفوظ ہو جائیں۔ خانقاہوں سے وابستہ صوفیائے کرام اور ان کے سلسلہ تصوف و سلوک کے تعارف اور نشر و اشاعت کے لئے باقاعدہ ادارے قائم کئے جائیں جو صوفیا کی علمی تصانیف مرتب اور محفوظ کرنے کی ذمہ داری سنبھالیں۔ اگر کسی خانقاہ پر پہلے سے کوئی اکادمی کام کر رہی ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اہل علم کی مدد سے سیمینار اور کانفرنسوں کا اہتمام کیا کرے۔' اس سلسلے کو اور آگے بڑھاتے ہوئے تصنیف و تالیف کا اہتمام کیا جائے تاکہ صوفیاء کرام کے نظریات اور ان کے کارناموں کو عام لوگوں تک پہنچایا جا سکے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضروری ہے کہ تاریخی عمارات تک پہنچنے کے لئے بہتر سڑکیں تعمیر کی جائیں تاکہ زائرین آسانی اور تیز رفتاری سے وہاں پہنچ سکیں اور وہاں ان کے قیام کے لئے اچھے ہوٹل بھی ہونے چاہئیں۔ تاریخی عمارتوں کے اردگرد جو تجاوزات ان کے حسن کو گہنا رہی

ہیں انہیں منہدم کیا جائے اور ہو سکے تو ان مقابر اور مساجد کے چاروں طرف سبزہ زار اور دوسرے زیبائشی پودے اگائے جائیں۔ ان عمارتوں کی اندرونی حالت بھی بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ اس میں نہ صرف سنگ و خشت سے ان کی مرمت کی جائے بلکہ عالموں، ادیبوں اور دانش وروں کی علمی پیاس بجھانے کے لئے وہاں وہ کتب ضرور رکھی جائیں جن کا کسی نہ کسی طرح صاحب مزار سے تعلق ہو۔ اس کے علاوہ معلوماتی قسم کے پمفلٹ شائع کر کے وہاں رکھے جائیں جنہیں زائرین قیمت ادا کر کے خریدیں اور ساتھ اس طرح کی تعارفی تحریریں بھی آویزاں کی جائیں جن میں صاحب مرقد کے بارے میں تعارف دیا گیا ہو۔ یہ تعارف کئی ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ہونا چاہئے۔

حوالہ جات

۱۔ Ernst Ahmed، Muslim Architic، کراچی، ۱۹۷۴ء، ۱۔۲

۲۔ مبارزالدین رفعت (مترجم)، اسلامی فن تعمیر، ج۔ن، ۱۹۵۲ء، ۱۷۔۱۸

۳۔ دائرہ معارف اسلامیہ (جلد نمبر ۱۵)، لاہور، ۱۹۷۵ء، ۶۴۷

۴۔ ایضاً، ۶۶۷

۵۔ Percy Brown, Early Indo-Islamic Art and its relations to the art of the Seljuqs and Iran Indo-Iranica, 1947, vol. II No. 2

۶۔ Percy Brown, Indian Architecture (Islamic period 3rd ed.)، بمبئی، س۔ن، ۱۰۔۲۰

۷۔ مسعود حسن شہاب، خطہ پاک اوچ، بہاول پور، ۱۹۸۲ء، ۲۵۹

۸۔ ایضاً، ۲۵۹

۹۔ ایضاً، ۲۶۰

۱۰۔ ایضاً، ۳۲۹

۱۱۔ مفتی غلام سرور، مخزن پنجاب، (مفتی صاحب نے ڈیوڈ راس کے حوالے سے جو "دی لینڈ آف فائیو ریورز اینڈ سندھ" کے مصنف ہیں کے حوالے سے اوچ کی پرانی تاریخ مرتب کی

ہے)

۱۲۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، کراچی، ۱۹۸۳ء، ۱۸۸۔۱۹۸

۱۳۔ Ahmad Nabi Khan, Islamic Architecture of Pakistan: An Analytical Exposition اسلام آباد، ۱۹۹۰، ۲۶

۱۴۔ ایضاً“ ۲۶۔۲۸

۱۵۔ Ahmad Nabi Khan,Uchchh: History and Architecture، اسلام آباد، ۱۹۸۰ء، ۵۴۔۵۶

۱۶۔ مسعود حسن شہاب، بحوالہ سابقہ، ۳۳۲۔۳۳۳

۱۷۔ احمد نبی خان، بحوالہ سابقہ، ۶۴۔۶۵، ۱۹۵۰ء، مزید تفصیل کیلئے دیکھئے E.B. Smith The Dome London 1950 41

۱۸۔ احمد نبی خان، بحوالہ سابقہ، ۵۹

۱۹۔ ایضاً“ ۶۶۔۶۷

۲۰۔ ایضاً“ ۶۷

۲۱۔ ایضاً“ ۵۹

۲۲۔ ایضاً“ ۵۶۔۵۹

۲۳۔ مسعود حسن شہاب، بحوالہ سابقہ، ۳۳۳۔۳۳۴

۲۴۔ ایضاً“ ۴۰۸

۲۵۔ احمد نبی خان، بحوالہ سابقہ، ۶۸

۲۶۔ ایضاً“ ۶۸

۲۷۔ صدیق طاہر، وادیٔ ہاکڑہ اور اس کے آثار، بہاولپور، ۱۹۸۲ء، ۱۵۹

۲۸۔ ایضاً“ ۱۵۹

۲۹۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (تیرھویں جلد)، علاقائی ادبیات مغربی پاکستان (جلد اول)، لاہور، ۱۹۷۱ء، ۲۰۲۔۲۱۰

۳۰۔ Sheikh Ahmad,Muslim Architecture، کراچی، ۱۹۷۴ء، ۱۔۲

۳۱۔ احمد نبی خان، بحوالہ سابقہ، ۶۰

۳۲۔ احمد نبی خان، Islamic Architecture of Pakistan، ۷۸۔۸۲

۳۳۔ Ernst Kuhnel (Trans.) Katherine Watson Islamic Art and Architecture، لندن، ۱۹۶۶ء، ۲۳

۳۴۔ Ernst Diez, Islamic Architecture: Principles and Types in Survey iii, 924

۳۵۔ احمد نبی خان، بحوالہ سابقہ، ۵۰۔۵۳، مزید دیکھئے، احمد نبی خان، Uchchh، ۶۹۔۷۰

۳۶۔ ایضاً، ۷۰۔۷۱